مولانا محمد حنیف ندوی

# فنونِ جمیلہ اور اسلام

گزشتہ شماروں میں ہم قدرے تفصیل سے ان اصولوں اور پیمانوں کی تشریح کر چکے ہیں جن سے اسلامی تہذیب و تمدن کا مزاج متعین ہوتا ہے اور یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند متعین مسائل کے حوالے سے یہ بتائیں کہ ان کے مقابلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے تاکہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے نقوش نکھر کر فکر و ذہن کے سامنے آسکیں۔

ان مسائل میں سرِ فہرست یہ بات ہے کہ اسلام فنونِ لطیفہ کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے بارہ میں کس دانشِ خاص کا حامل ہے۔ پہلے ہی قدم پر اس حقیقت کو جان لینا ضروری ہے کہ اسلام جس طرح اس کائنات کو معروضی (OBJECTIVE) شئی سمجھتا ہے، اس طرح اس کے نزدیک حسن و جمال کا وجود بھی معروضی ہے۔ یہی نہیں حسن و جمال کا احساس بھی اس کے نقطۂ نظر سے اتنا ہی فطری ہے جتنا کسی شخص کا اپنے اعمال اور اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی اشیا کے بارہ میں یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں یہ کام موزوں اور قرینِ عقل و دانش ہے۔ اور یہ کام موزوں نہیں۔ یا یہ چیزیں ڈھب کی ہیں۔ اور فلاں فلاں شی اس زمرے میں شامل ہونے کے لائق نہیں۔ احساسِ جمال یا ذوقِ حسن بھی اسی فطرت کا انمول فیضان ہے، جس کے بل پر انسان مختلف اشیا کے بارہ میں افادیت کا فیصلہ صادر کرتا ہے، یا بعض اعمال کے حسن و قبح سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ یہی فطرت اسے بتاتی ہے کہ رنگت و نکہت کا یہ امتزاج نظر کو بھاتا اور فرحت بخشتا ہے اور آہنگ و آواز کا یہ تناسب دل کے خوابیدہ نغموں کو بیدار کرتا اور طرب و انبساط کی کیفیتوں کو مادیت کی آلائشوں سے پاک کر کے روحانی کیف سے دوچار کرتا ہے۔

یہ دنیا عارضی اور فانی سہی آخر حسین کیوں نہ ہو جب ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آنے کی وجہ سے یہ تسلیم

کرتے ہیں کہ اس کو اس پروردگار نے ترتیب دیا ہے جو نقاشِ ازل اور خطاطِ خوب تر کی صفت سے متصف ہے، جو خود بھی جمیل ہے اور جمال کا سرچشمہ بھی۔ اس صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کا ایک ایک نقش اور ایک ایک نقطہ و شوشہ اپنی آغوش میں حسن و جمال کی فراوانیاں لیے ہوتے ہو تخلیق و آفرینش کے متعلق قرآن حکیم نے واضح طور پر اس نکتہ کی نشاندہی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیضانِ حسن نے اس عالم کو محض طبعی تقاضوں اور طبیعی ضرورتوں کے پیشِ نظر پیدا نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ اس کے بناؤ سنوار کا اہتمام بھی کیا ہے۔ اس کی نوک پلک بھی درست کی ہے اور اسمیں ان خوبیوں، اور رعنائیوں کو بھی ودیعت کیا ہے، جن کو دیکھ کر نگاہِ امتیاز بے اختیار پکار اٹھتی ہے:

فتبارک اللہ احسن الخالقین ط۔

## کسی شی کا وجود میں آنا اور حسین ہونا دو مختلف حقیقتیں ہیں

کسی شی کو وجود بخشنا اور پھر اس خلعتِ وجود کو سجانا اور اس میں بھبن اور حسن پیدا کرنا دو الگ الگ حقیقتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دستِ ہنر پرور نے بیک وقت ان دونوں کو اپنی تجلیاتِ تخلیق میں اجاگر کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| (۱) الذی احسن کل شئ خلقه۔ (سجدہ: ۷) | جس نے ہر شی کو بہت اچھی طرح بنایا۔ اس کو پیدا کیا۔ |
| (۲) وصورکم فاحسن صورکم۔ (تغابن: ۲) | اسی نے تمھاری صورتیں بنائیں اور عمدگی سے بنائیں۔ |
| (۳) ولکم فیها جمال حین تریحون وحین تسرحون۔ (نحل: ۶) | اور جب شام کو تم ان کو جنگل سے لاتے ہو۔ اور جب صبح صبح انھیں جنگل میں چرانے کے لیے لے جاتے ہو۔ اس میں تمھارے لیے ان کے جمال کی بہرہ مندی ہے۔ |

قرآن مجید کی یہ آیات اس چیز پر شاہد عدل کی حیثیت رکھتی ہیں کہ حسن و جمال سے متصف اشیا نہ صرف خارج میں اپنا وجود و پیراہن رکھتی ہیں اور سچی معروضیت سے بہرہ مند ہیں بلکہ حسن و جمال کسی شی کی ترکیب و تخلیق سے زائد ایک حقیقت و اضافہ کا نام ہے۔

حُسن و جمال کی معروضیت فطرت کا مسلمہ ہے۔ آخر وہ کون بدذوق ہوگا جو پھول کی نزاکت و نکہت کا انکار کرے۔ کس کا جگر ہے جو دریا کی سبک روی اور سحر سے متاثر نہ ہو۔ اور کس کا حوصلہ ہے کہ آبشاروں میں بہتی ہوئی چاندنی کو دیکھے اور اس کی جھنکار سے لطف اندوز نہ ہو۔ کوہساروں میں گھومے پھرے اور ان میں بکھرے ہوئے قطعات سبزہ و شاداب کا نظارہ کرے اور دیدہ و نگاہ کو تاثر و کیف سے بچائے رکھے۔ غور کیجیے تو ذوق و وجدان کی کتنی بڑی محرومی ہے کہ قدرت کے اس شاہکار انسان پر نظریں اٹھیں اور اس کے حسن ظاہری و باطنی کی جلوہ طرازیاں خود اس سے خراجِ تحسین وصول نہ کر پائیں۔

حُسن ایک جیتی جاگتی حقیقت اور فطرت و قدرت کا وہ اعجاز و کرشمہ ہے، جسے فرشتوں تک نے جانا بوجھا اور تسلیم کیا ہے اور یہی وہ مضمون و معنی ہے جس نے شعر و نغمہ اور ادب و تحریر کے نوشتوں کو حیاتِ جاوداں بخشی ہے۔

## حُسن و جمال کے جادہ میں بورژوائی حکما کی غلط اندیشی

مسئلہ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں اسلام کا فلسفۂ حسن و جمال بورژوائی فلسفہ سے جدا ہوتا ہے۔ اسلام اس بات کو نہیں مانتا کہ حُسن و جمال محض موضوعی ہے اور اس کی جلوہ طرازیاں اشیا سے زیادہ نظر، فکر اور ذہن کی مناسبتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی بورژوائی فلسفہ کی ترجمانی ہیوم نے یوں کی ہے "فطرت کے مختلف مظاہر میں جو خوبصورتی محسوس ہوتی ہے وہ دراصل فکر و ذہن کی ان کروٹوں میں موجزن ہے جو سوچتا اور غور کرتا ہے۔ خود اشیا اس کا وجود نہیں"۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حسن و جمال تمام تر معروضیت ہی کا مرہونِ منت نہیں بلکہ اس کے اظہار میں اکثر و بیشتر موضوعیت کی طرفہ طرازیوں کا بھی دخل ہے۔ اس میں مجاز و تشبیہ کی کارفرمائی کا بھی حصہ ہے، اور اس تلازم کا بھی کردار ہے جو دو حسین اشیا میں قائم کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً جب شاعر محبوب کی نیم باز آنکھوں میں اس سکر و مستی کو دیکھتا ہے جو مے اور شراب میں پائی جاتی ہے۔ یا ہونٹوں کی نزاکت کو گلاب کی پنکھڑیوں سے تشبیہ دیتا ہے تو بلاشبہ یہ دونوں صورتیں اپنے جلو میں ایک طرح کی موضوعیت کو لیے ہوئے ہیں ایک طرح کی خیال آرائی اور انتزاع کا نتیجہ ہیں، جس کو شاعر کی چشمِ تصور بھانپ لیتی ہے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ اس میں ایک طرح کے تلازم نے لطف دوبالا کر دیا ہے ورنہ کہاں آنکھوں کی قدرتی سرمستی،

پاکیزہ سکر اور خمار۔ اور کہاں شراب کا پیدا کردہ نشہ اس طرح گلاب کی پنکھڑی اور لب کی تازگی میں مماثلت کے باوجود نمایاں فرق ہے۔ یہ دونوں حسین ہیں۔ تاہم ان دونوں میں رشتہ و تلازم کی نوعیت بہرحال موضوعیت کی حامل ہے۔ آنکھ کا سکر اس لیے حسین ہے کہ اس سے شراب کی سرمستیوں کا پتہ چلتا ہے اور یہ سرمستی اس بنا پر دل کو بھاتی ہے کہ اس سے کسی کی نگاہِ نیم باز کا تصور ابھرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح گلاب کی پنکھڑیاں اس بنا پر زیادہ حسین معلوم ہوتی ہیں کہ ان سے کسی کے شاداب و شگفتہ ہونٹوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ہونٹ اس وجہ سے نگاہ و نظر میں زیادہ جچتے ہیں کہ ان کی نزاکت سے گلاب کی پنکھڑیاں فکر و ذہن کی سطح پر شمیم آرائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر ہم یہ کہیں گے کہ کبھی کبھی حسن و جمال کا تصور محض موضوعی ہوتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات ہم جنگل کو بھی روکش و بستان سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور ترتیب، نظام اور توازن کی ہم آہنگیوں سے گھبرا کر فطرت کے ان بکھرے ہوئے اور پریشان مظاہر میں بھی حسن و جمال کی تابانیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں، جن میں بظاہر کوئی توازن یا تناسب نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود ہمیں اصرار ہے کہ حسن و جمال کا وجود حقیقی ہے، اور اس کا تعلق اس ذاتِ گرامی اور اس ذاتِ ستودہ صفات سے ہے جس نے وجود کا یہ رنگا رنگ شیش محل ترتیب دیا ہے۔

حسن و جمال کی معروضیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو گا کہ ایک فن کار حسن و جمال کی جن تخلیقات پہ ناز کرتا ہے اور ان میں خط، رنگ و نقش کی جن خوبیوں کو سموتا یا آواز و آہنگ کی جن مناسبتوں کو اجاگر کرتا ہے ان سب کا مواد خود فطرت نے مہیا کیا ہے، ذہن انسانی نے نہیں۔ یعنی دنیا میں اگر یہ ہرے بھرے درخت نہ ہوتے، پھول پتیوں کا وجود نہ ہوتا، ان میں یہ رنگ اور نکھار نہ پایا جاتا تو کیا ممکن تھا کہ مصور اپنی تصویروں میں رنگ کی شعبدہ طرازیوں کا یوں اظہار کر سکتا۔ یہ محض قدرت کا فیض ہے کہ اس نے ہمیں رنگ کی بوقلمونیوں سے آشنا کیا اور بتایا کہ رنگ و لون کے امتزاج سے جو حسین چیزیں جلوہ آرا ہوتی ہیں ان کو ہم نے ترتیب دیا اور پیدا کیا ہے:

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ۔ (بقرہ: ۱۳۸)

کہہ دو ہم نے خدا کا رنگ اختیار کر لیا ہے اور خدا کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔

افرأیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون۔ (واقعہ: ۶۴)

بھلا دیکھو تو جو کچھ بوتے ہو تو کیا تم اُسے اگاتے ہو یا ہم۔

وما ذرأ لکم فی الارض مختلفاً الوانه۔ (نحل: ۱۳)

اور جو طرح طرح کے رنگوں کی چیزیں اُس نے زمین میں پیدا کیں وہ تمھارے زیر فرمان کر دیں۔

ٹھیک اسی طرح اگر ہواؤں کی سرسراہٹ، بارش کی رِم جھم، پپیہا اور بلبل کی آوازیں موسیقی، جھنکار، کھنک کے اسالیب پہلے سے پنہاں نہ ہوتے تو نغمہ طراز خشک چوب، خشک تار اور خشک پوست سے آوازِ دوست کیونکر سن پاتا۔ یا حضرت داؤد کی تسبیح میں پہاڑ اور پرندے کیونکر شرکت کرتے۔

ولقد اٰتینا داؤد منا فضلاً یاجبال اوّبی معه والطیر۔ (سبا: ۱۰)

اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے خوش تاثیری کی برتری بخشی تھی۔ اے پہاڑو! ان کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو ان کا مسخر کر دیا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے قدرت حسین ہی نہیں حُسن پرور بھی ہے۔ ذوق شرط ہے یہ موجود ہو تو پوری کائنات رنگ و نکہت کی آئینہ دار ہوگی اور انسان اس لائق ہوگا کہ ولیم بٹلر (WILLIAM - BUTLER) کی زبان میں یہ کہہ سکے کہ "حُسن ہر کہیں جلوہ گر ہے اور یہ وہ سمندر ہے جس میں جزر نہیں"۔ اور ذوق نہ ہو تو حسن وجمال کی معروضیت کا یقین دلانا مشکل ہو جائے گا۔ یہی نہیں۔ اس صورت میں یہ کائنات سرے سے اس قابل ہی نہ رہے گی کہ کوئی یہاں رہے اور اس سے دلچسپی رکھے۔

## اصل مسئلہ

ہمارے نزدیک یہ بورژوائی حکما کی ستم ظریفی اور کور ذوقی ہے کہ حسن وجمال کے بارہ میں انھوں نے اس بے کار بحث کو چھیڑ دیا کہ یہ معروضی ہے یا موضوعی۔ اس کا تعلق اشیا سے ہے، یا ذہن وفکر کی تخلیق وآفرینش سے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ حسن وجمال کی رعنائیوں کو فن کے سانچوں میں کس طرح ڈھالنا چاہیے اور پھر اس فن سے کیونکر قوموں میں تہذیب وتمدن کے روحانی واخلاقی لطائف کا کام لینا چاہیے۔

یہ تو بہرحال طے ہے کہ احساس جمال کے بارہ میں کسی طرح کا بخل واکتناز جائز نہیں۔ ہر فن کار کا یہ فرض ہے کہ فطرت کے اس عطیہ کو نہ صرف یہ کہ قبول کرے بلکہ زندگی کے ہر ہر مرحلہ پر ان کا اظہار کرے

اس کو معاشرہ میں پھیلائے اور اس طرح فکر و ذوق کا جزو بنا دے کہ معاشرہ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کو اخلاق و روحانیت کی اصطلاح میں ہم قبیح، یا غیر حسین کہہ سکیں۔

ظاہر ہے اس صورت میں حسن کے اظہار و ابلاغ کا نہج آزادانہ نہیں رہے گا بلکہ اس کے لیے کچھ اصول اور پیمانے وضع کرنے ہوں گے۔ فن برائے فن کا نظریہ اب فرسودہ ہو چکا ہے اور تہذیب و تمدن کے بازار میں اس کا چلن نہیں رہا۔ اس کے بجائے اب یہ نظریہ فروغ پا رہا ہے کہ فن کو اصلاح و تعمیر کی کوششوں میں شریک ہونا چاہیے۔

## کیا فن آزاد ہے اور فن کار معاشرہ کا جز نہیں؟

فن آزاد ہے۔ اس پر کوئی روحانی اور اخلاقی پابندی عائد نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی نشوونما ارتقا کے اصول اپنے ہیں۔ اس کی اپنی راہ اور منزل ہے جو بے کراں اور حدود ناآشنا ہے۔ فن برائے فن کی تائید میں عموماً اس طرح کے دعوے پیش کیے جاتے ہیں لیکن یہ سب دعوے محلِ نظر ہیں۔ ہم اس معاملہ میں ارسطو کے ہم نوا ہیں۔ ہمارے نزدیک اگر فن کار معاشرہ کا شائستہ اور باوقار فرد ہے، اور کوئی بھی معاشرہ اخلاقی و روحانی اقدار سے بے نیاز رہ کر ترقی نہیں کر سکتا تو اس صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ فن کار کچھ کلیات و تصورات کو اپنا کر آگے بڑھے، اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اس عمدگی اور سلیقے سے استعمال کرے کہ معاشرہ حسن و خوبی کی قدروں کو ذوق کی حد تک قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس لیے کہ اگر فن سے معاشرہ میں اخلاقی و روحانی قدریں نہیں نکھرتیں، افراد انسانی میں صحیح ذوق کی تربیت نہیں ہو پاتی اور قلب و ضمیر اعلیٰ جمالیاتی پیمانوں سے ناآشنا رہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فن ناکام رہا۔ فن اسی وقت تک بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے، جب اس کی کوششوں سے خود معاشرہ آگے بڑھے، معاشرہ ترقی کرے، اور معاشرہ کی گتھیاں اس کی تابش و ضو کی جلوہ آرائیوں سے سلجھاؤ اختیار کریں، لیکن اگر فن مشکلات کو سلجھانے میں کوئی مدد نہیں کرتا، پیش آیند مسائل پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا، یا قانون، قاعدہ اور روایت کی آنکھوں سے اوجھل ان نازک گوشوں کو منظرِ عام پر نہیں لاتا، جن کا تعلق باطن، اور معنی سے ہے اسے تو وہ فن نہیں بے گار یا بے کاری کا ایک مشغلہ کہنا چاہیے جس سے تفریح کا کام تو لیا جا سکتا ہے اصلاح و تعمیر اور ذوق کی پاکیزگی کا نہیں۔

فن برائے فن کا نعرہ بعض چالاک حکمرانوں نے اس لیے گھڑا تھا تاکہ ان کے ملحدانہ خیالات و افکار

کی اشاعت و فروغ کے لیے وجہ جواز پیدا ہو سکے اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جا سکے، جو روحانی اور معنوی اقدار کی تقدیس کا قائل نہ ہو، جو سطحی مادیت کا پرستار ہو اور زندگی کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہ ہو کہ یہ حیاتیاتی تقاضوں کی تکمیل و پرورش کا دوسرا نام ہے اور یا پھر نعرہ اس گھٹن اور تنگ نظری کے ردِّ عمل کے طور پر اُبھرا جس کو ہیرانِ کلیسا نے صدیوں نہ صرف روا رکھا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی اور ہر اس شخص کو لائقِ تعزیر گردانا جس نے کلیسا کے تعصبات کا ساتھ نہ دیا اور عقل و دانش کے تقاضوں کی تائید کی۔

## فن کار کا مقام

ہمارے نزدیک فن کار کا درجہ ایک مصلح سے کم نہیں۔ یہ بسا اوقات برش اور قلم کی ایک جنبش سے ایسے عجیب و غریب نقوش ابھار دیتا ہے، جن سے قانون و آئین کی بے مائیگی کا اندازہ ہوتا ہے اور ایک اچھے خاصے مہذب و شائستہ معاشرہ کی وہ بھیانک غلطیاں فکر و نظر کے سامنے آموجود ہوتی ہیں، عام حالات میں جن کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک مغنی شعلہ نوا اور مطربِ جاں فزا، دل میں طرب و انبساط کے بعض مرتبہ ایسے نازک گوشوں کو بیدار کر دیتا ہے کہ جن کی بیداری سے زندگی کا پورا دبستان مہک اٹھتا ہے۔ یاد رہے کہ فن کار کی نگاہِ احتساب معاشرہ کے عیوب ہی کو تلاش نہیں کرتی، اس کے لیے مرہم اور مداوے کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ صرف تفریح اور خوشی کے موتی ہی نہیں بکھیرتی، زندگی کی تمام نشاط آفرینیوں میں اضافہ کا موجب بھی بنتی ہے۔ زندگی کو ولولہ تازہ بھی عطا کرتی ہے اور تہذیب و تمدن کو ادراک و احساس کے ان لطائف سے بھی مالا مال کرتی ہے جن کے بغیر زندگی ٹھس اور بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے غرض فن ایک حسین طاقت ہے اور ایک حسین قوت ہے اور اصلاح و تعمیر کا ایسا اسلوب ہے جو بہر حال کارگر ہو کر رہتا ہے۔

## فنونِ جمیلہ کے مشمولات اور اسلام میں اس کی اہمیت

اس سے پہلے کہ ہم فنونِ جمیلہ کو خصوصیت سے بحث و نظر کا موضوع ٹھہرائیں، یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلام کا تعلق ان سے بالواسطہ اور ضمنی سا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام جمالیاتی نقطۂ نظر کی اہمیتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ اس سے ابلاغ، تعبیر اور بلندیٔ کردار و فکر کا کام لیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام جمالیات سے یہ کام لینا چاہتا ہے کہ اس کے ذریعہ

انسانی فکر کی زلفِ دوتا کو سنوارا جائے اور اس کے کردار و عمل میں حُسن و جمال کی تابانیوں کو اس ڈھب سے سمو دیا جائے جس سے شرف انسانی کی روایات زندہ و تابندہ نظر آئیں۔ اس کے نزدیک اصل اہمیت اس حسین و جمیل عقیدہ کو حاصل ہے جس کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس عمل کو ہے جس کو قرآن عملِ صالح کہہ کر پکارتا ہے۔ جان کیٹس (JOHN KEATS) نے ایک جگہ بجا طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ حسن تحریر و انشا کا مقام ہے۔ بہر حال حسن عمل کے بعد ہے یعنی پہلے عمل و کردار کی استواری و پاکیزگی کا درجہ ہے۔ اس کے نکھار اور اس کی پچھبن اور سج دھج کا مقام ہے، اس کے بعد تحریر و انشا کی اہمیتیں ہیں۔

اسلام کے بارہ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ یہ ایک دین ہے، ایک ضابطۂ حیات ہے، اس کا مقصد فرد و معاشرہ کی اصلاح و تعمیر ہے۔ اس کے اپنے کچھ اخلاق و روحانی معیار اور پیمانے ہیں اور اپنا ایک مزاج اور تشخص ہے اور فنونِ جمیلہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں دین یا زندگی کے نہج و اسلوب کی نہیں محض ذریعۂ ابلاغ کی ہے۔ اس کی مصلحتیں، اس کے تقاضے اور مضمرات بہر حال دین کے تابع رہیں گے اور اسی نسبت سے ان کے جواز یا افادیت کا دائرہ متعین ہوگا، جس نسبت سے یہ اسلامی اقدار کے فروغ و اشاعت کا ذریعہ قرار پائیں گے۔

اس وضاحت کے بعد آیئے اب ہم فنونِ جمیلہ کے مشمولات کے بارہ میں براہِ راست اپنی رائے کا اظہار کریں۔ غالباً اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم فنونِ لطیفہ کے دائرہ میں آنے والے فنون کی نشاندہی کریں۔ ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ اس میں خطاطی، تصویر، موسیقی، رقص، مجسمہ سازی اور تزئین و آرائش کے وہ تمام مظاہر داخل ہیں جو تزئین و آرائش کے علاوہ اپنی آغوش میں کچھ معانی اور دلالتیں بھی لیے ہوتے ہیں۔ ادب و انشا میں نثر کے شہ پاروں کو ہم فنونِ جمیلہ میں عمداً شمار نہیں کرتے کیونکہ ان میں دلالت اور بیان کا پہلو واضح اور متعین ہوتا ہے جس کو ہر کوئی جانتا بوجھتا اور سمجھتا ہے۔ فنونِ جمیلہ کی تعریف ہمارے ہاں یہ ہے کہ ان کا تعلق اظہار کے ان اسالیب سے ہے جن میں ایک طرح کے ابہام اور گہرائی کا ہونا ضروری ہے۔ ظاہر ہے اس تعریف کا اطلاق خط، رنگ اور آہنگ کی صرف انہی مرکب صورتوں پر ہو سکے گا جن کو سمجھنے کے لیے زبان، محاورات اور گرامر سے زیادہ ذوق و وجدان کے لطائف کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ شعر و ادب کے شاہکار

اس بنا پر بھی ہمارے دائرۂ بحث میں نہیں آتے کہ ان کے بارہ میں کوئی اختلاف رائے سرے سے موجود نہیں، ان کو شروع ہی سے اسلامی مزاج و ذوق نے، اپنا لیا ہے۔ اپنایا ہی نہیں اس کو مضمون و معنی کی گہرائیوں سے مالا مال بھی کیا ہے۔ اس بارہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ مسلمان شعرا نے اپنے اشعار میں اگرچہ کسی دور میں بھی ان روحانی و اخلاقی حدود، اور پیمانوں کا خیال نہیں رکھا جن کو اسلام معاشرہ کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری ٹھہراتا ہے۔ تاہم ہمیشہ اسلامی ذوق نے اسے گوارا کیا اور ان اشعار کی تخلیقاتِ ادبی پر اظہارِ تحسین کیا۔

## رقص اور مجسمہ سازی

فنونِ لطیفہ پر تفصیلی گفتگو سے پہلے موجودہ رقص اور مجسمہ سازی کے بارہ میں ہم صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ان کے لیے اسلامی فقہ و تہذیب میں جواز کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ عورت جسے ماں بننا ہے، جسے بلند کردار اور پاکیزہ نگاہ افراد کو جنم دینا ہے اور جسے بہرحال گھر کی چار دیواری کی حد تک عفاف، اخلاص، متانت، وقار اور انسانی شرف کے تقاضوں کو محفوظ و زندہ رکھنا ہے سرِ عام ناچے اور جسم کے پیچ و خم کا اس طرح اظہار کرے کہ ہر دیکھنے والا کلیجہ تھام کر رہ جائے۔ مغرب نے اگر اس کی حوصلہ افزائی کی ہے تو اس کی سزا بھی اسے مل رہی ہے۔ آج وہ گھر کے اس سکون، اس روحانیت اور تقدس سے قطعی محروم ہے جس کو ایک عفیف اور پاکباز عورت ہی قائم رکھ سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رقص سے کلب آباد ہیں، مگر اس کی وجہ سے گھروں میں جو سناٹا ہے اور ازدواجی تعلقات میں نفاق کی جو عفونت ہے وہ کس درجہ تکلیف دہ ہے۔ اصل میں اختلاف فلسفۂ حیات کا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ عفاف، پاکیزگی اور حیا کو عورت کا زیور نہیں سمجھتا اور فسق و فجور کی زندگی میں کسی طرح کا عیب محسوس نہیں کرتا تو ظاہر ہے کہ پھر اس مشغلہ سے زیادہ خوش کن اور کوئی مشغلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر معاشرہ کچھ اخلاقی و روحانی اقدار پر ایمان رکھتا ہے اور وقتی لطف اندوزی سے کہیں زیادہ اس بات کو اہمیت دیتا ہے کہ لطف و کیف کے لمحے زیادہ استوار اور دائمی شکل اختیار کریں تو اس صورت میں رقص کی تائید نہیں کی جا سکتی۔

ہم جانتے ہیں کہ رقص بھی فنی دلالتوں سے مالا مال ہے اور اس میں بھی معانی اور گہرائی کا بہرحال خیال رکھا جاتا ہے۔ ہم شاعری کی زبان میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک رقاصہ پیچ و خم سے غزل و شعر کے

جن پہلوؤں سے فکر و ذہن کو متاثر کر سکتی ہے شاید الفاظ سے یہ تاثر و کیف پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن جب آپ تہذیب کے مسئلہ پر گفتگو کریں گے اور زیرِ بحث سوال آپ کے سامنے یہ ہوگا رقص کو اس تہذیبی چوکھٹے میں کہاں سجایا جائے تو اس وقت دلالت و معنی سے قطع نظر یہ دیکھا جائے گا کہ اس سے معاشرہ کیا حاصل کرتا ہے۔ کیا کھوتا اور کیا پاتا ہے۔ کن عاجل اور وقتی تفریحات کو حاصل کرتا ہے اور کن دائمی محرومیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ ہم اس نقطہ پر غور کریں گے کہ کیا کائنات کی خود اس پاکیزہ اور لائق صد فخر مخلوق کے لیے یہ جائز ہوگا کہ یہ ہوس و جنس کی اس آگ میں بغیر سوچے سمجھے کود پڑے جس کو مردوں نے محض اپنی تسکینِ نفس کے لیے بھڑکایا ہے۔

سوال یہ ہے کہ رقص کی خواہش اور غیر مردوں کے ساتھ ناچنے اور تھرکنے کی آرزو۔ عورت کی خواہش و آرزو ہے یا مرد کی۔ یہ مطالبہ نسوانی فطرت کا ہے یعنی اس حسین و عفیف وجود کا ہے جو پاکیزگی کو جنم دیتی ہے جو عفاف و عصمت کی قدروں کی خلاق ہے۔ یا اسے مرد کی آرزوئے جنس و ہوس کی صدائے بازگشت ہی سے تعبیر کرنا ممکن ہے۔ ہم مسئلہ کے اس پہلو کو پوری پوری اہمیت دینے کے لیے تیار ہیں کہ اگر رقص و سرود کے ان شبینہ کلبوں میں واقعی ایک عورت کی پرورش ہوتی ہے، ایک عورت کا ضمیر و وجدان بیدار ہوتا ہے اور ایک عورت کی انا اور روح نکھرتی اور متعین ہوتی ہے تو اس کی قطعی اجازت ہونا چاہیے اور مردوں کو کوئی حق نہیں کہ ان کی اس خواہش و آرزو کی مخالفت کریں لیکن اگر اس سے عورت کا وقار مجروح ہوتا ہے، اس کی ادائے زرنگار تار تار ہوتی ہے، اس کی وفا مشکوک ٹھہرتی ہے اور اس ہنستی، کھیلتی، اور فرطِ انبساط سے مدہوش رقصاں نظر آنے والی عورت کا دل مرد کے اس جبر پر نالاں ہے، تو اس صورت میں خالص تہذیبی نقطہ نظر سے مسئلہ کی شکل اور ہوگی۔

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس میں رقص کی وہ سادہ اور غیر فنی صورتیں داخل نہیں ہیں جن کی حیثیت معصومانہ ورزش یا اچھل کود سے زیادہ نہیں، نیز اس میں وہ رقص بھی داخل نہیں جو وجد و کیف کی اضطراری کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

## مجسمہ سازی اور تقاضائے توحید

بالکل یہی حال مجسمہ سازی کا ہے - یہ فن بھی فن ہونے کے باوجود اسلام کے توحید آشنا مزاج سے قطعی میل نہیں کھاتا - اسلام کے نقطۂ نظر سے تیشۂ آذر سے ابراہیم کا وہ تیشہ کہیں عزیز ہے، جس کی ایک ہی ضرب سے بُت پرستی کی رسم کہنہ پاش پاش ہوئی -

فراغ علیہم ضربًا بالیمین ٥ (صافات: ۹۳) اور لوگوں کی نظر بچا کر وہ داہنے ہاتھ سے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگا۔

یوں بھی اس فن کا تعلق کسی شخص کے انفرادی ذوقِ تخلیق سے ہے - سوال یہ ہے کہ اس سے بحیثیتِ مجموعی تہذیبِ انسانی کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور اقدارِ حیات کی دوڑ میں انسان کتنے قدم آگے بڑھتا ہے - یہ صحیح ہے کہ اس فن میں بھی دلالت و اظہار کے متعدد پہلو پائے جاتے ہیں مگر دلالت و اظہار کے دوسرے ذرائع اس سے کہیں زیادہ واضح، موثر اور بلیغ ہیں - ان سے کیوں تعرض نہ کیا جائے - انسان فانی ہے اور جس چیز کو بقا حاصل ہے، وہ اس کا وہ ڈھانچہ نہیں جس کو مجسمہ ساز کا فن ترتیب دیتا ہے - بلکہ وہ کردار، وہ عمل ہے جس میں اپج، تخلیق اور بلندی ہے - اور مجسمہ سازی سے یہ غلط فہمی پھیلتی ہے کہ اصل اہمیت عمل و کردار کی پاکیزگی کو حاصل نہیں، اس ذات کو حاصل ہے جس کو پتھر کے اس مجسمے میں زندہ کر دیا گیا ہے - اسلام اسی بنا پر مجسمہ سازی کا مخالف ہے کہ اس سے عظمت انسانی کا محور بدل جاتا ہے یعنی بجائے فکر و عمل اور سیرت کے ایک ذات، ایک شخص اور ایک صورت زیادہ اہم قرار پاتی ہے -

علاوہ ازیں مجسمہ سازی کے ساتھ اہلِ فن نے جس عُریانی کو وابستہ کر دیا ہے اور جس جس انداز سے سفلی جذبات کی تسکین کا اہتمام کیا ہے اس نے اس کی تہذیبی قدر و قیمت کو اور بھی گھٹا دیا ہے -

پہلے تو یہ خطرہ تھا کہ اس فن سے شخصیت پرستی کو فروغ حاصل ہوتا ہے جو تعلیم و تربیت کی فراوانیوں کے باوجود زائل نہیں ہوا - اب اس پر جنسی بے راہ روی کا مزید اضافہ ہوا ہے - ان حالات میں خالص تہذیبی نقطۂ نظر سے بھی اس کی تائید کرنا مشکل ہے - بشرطیکہ تہذیب سے مراد روح و فکر کی بالاتر تہذیب ہو - خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں اس مسئلے نے نزاع و اختلاف کی شکل اختیار نہیں کی -

اصل الجھاؤ یا اشکال تصویر اور موسیقی کے مسئلہ میں ہے جو ہمارے معاشرہ پر اثر انداز ہے۔ بالخصوص جب کہ ان دونوں کی ترتیب وساخت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے ارتقا سے فلم اور ٹیلیویژن کا رواج چل نکلا ہے۔ ٹیلیویژن خصوصیت کے ساتھ ایسا ہمہ گیر اور سائنسی اسلوب ہے، جو نئی نئی اخلاقی قدروں کو جنم دیتا، فنی خواہشوں کو ابھارتا، اور نوجوانوں میں نئے نئے رجحانات کی تخلیق کرتا ہے۔ اور لطف یہ ہے قبل اس کے کہ ہم اس کے نفع ونقصان کو اپنے ہاں کی تہذیبی ترازو میں تول کر دیکھتے، اس کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ کرتے، یہ زبردستی ہمارے گھروں میں گھس آیا ہے اور ہمارے ڈرائنگ روم کی زینت بن گیا ہے۔ اور اس تیزی سے اس نے قبولیت و پذیرائی کی منزلیں طے کی ہیں کہ لوگ اسے گھر کی ایک ضرورت کا درجہ دینے لگے ہیں۔

سوال یہ ہے اس اشکال کو کیونکر حل کیا جائے۔ اور اس کے تہذیبی و اخلاقی مضر اثرات سے نئی نسل کو کس طرح محفوظ رکھا جائے۔ یہ بات تو بہر حال طے ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتاریوں سے ابھر کر جو نتائج معاشرے میں پھیلتے ہیں، ان کو کسی بے جان فقہی بحث اور غیر موثر عدم جواز کے فتوے سے روک دینا ممکن نہیں۔ آخر آپ کس کس ایجاد کی مخالفت کریں گے۔ کس کس اصول مسلمہ اور اختراع کے آگے دیواریں چنیں گے۔ اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے سیلاب بے پناہ کے سامنے کہاں کہاں بند باندھیں گے۔ دور کیوں جایئے کیا ماضی میں علوم وفنون اور تحقیق وتفحص کے ریلوں کو کوئی روک سکا ہے اور انکشاف واختراع کے باغیانہ داعیوں کو کوئی قوم بھی پا بہ زنجیر کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں چرچ اور سائنس میں جو معرکہ آرائیاں رہی ہیں، ان کی روداد ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہے۔ علم وفضل کے محسن دانشوروں کو ہر طرح کی شہری مراعات سے محروم رکھا گیا۔ کلیسا کے مزعومات وخرافات کے خلاف لب کشائی کرنے والے اہلِ عقل کو بے دریغ جیلوں میں ڈالا گیا، سولیوں پر لٹکایا گیا، زندہ آگ میں جھونکا گیا، اور تعزیر وتعذیب کی وہ تمام صورتیں اختیار کی گئیں، جو تنگ نظری اور تعصب کو سوجھ سکتی تھیں۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا۔ ان رکاوٹوں اور سزاؤں کے علی الرغم علوم وفنون کا قافلہ برابر آگے بڑھتا رہا، اور وہ مذہب جس نے سائنس کے خلاف رزم آرائی کی تھی، مغرب میں ہمیشہ کے لیے اپنا وقار کھو بیٹھا۔

سوال یہ ہے جب انسانی ذہن بیدار ہو جائے، جب اس میں جستجو، تلاش وتفحص کے داعیے

جاگ اٹھیں، جب اس کے عزم و حوصلہ کے سامنے فطرت کی گرہیں آپ سے آپ کھلتی چلی جائیں، جب زمین خزائن اگل دے، زمین کا کوئی راز راز نہ رہے اور انسان کا دستِ شوخ آسمانوں کے گریبان تک جا پہنچے، ان حالات میں کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ کوئی الٹی زقند زمانے کے رخ کو پھیر دینے پر کامیاب ہوسکتی ہے۔ اور کچھ اس طرح کا ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے کہ انسانی فکر سائنس اور ٹیکنالوجی کے وہ مسلمات جن کی بنا پر سینما، ٹیلیویژن، ایکس رے وغیرہ نے جنم لیا ہے یکسر بھول جائے اور ان تجربات کی روشنی میں کوئی اگلا قدم نہ اٹھائے۔ اور جب ایسا نہیں ہوسکتا اور یقیناً نہیں ہوسکتا کہ ہم زمانے کے ارتقائی تقاضوں کا گلا گھونٹ دیں۔ اور ان کے افادی پہلوؤں سے کلیتاً محرومی اختیار کریں، تب دین کے حکیمانہ اندازِ فکر کا داعیہ مجبور کرے گا کہ ہم اپنے اجتہاد کو حرفیت پسندانہ انداز استدلال سے نکال کر افادیت و دانش کے وسیع تر سانچے میں ڈھالیں۔ اس کا رُخ بدلیں اور یوں سوچیں کہ ان ایجادات سے اور تصویر و آہنگ کے اس امتزاج سے قومی و ملی روایات کے احیا کا کام ہم کس طرح لے سکتے ہیں۔ کس طرح نژادِ نو کی تربیت کرسکتے ہیں اور کیونکر ان موثر ترین ذرائع سے ان اقدار کے فروغ و ارتقا کا سلسلہ آگے بڑھا سکتے ہیں جو ملک و ملت کی تعمیر کے لیے بنیادی اینٹ کا درجہ رکھتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں ہمیں یوں سوچنا چاہیے کہ اگر عہدِ جاہلیت کے بجائے اسلام آج نازل ہوتا اور سائنس اور تہذیب کے اس دور میں جلوہ فرما ہوتا تو پیش آمدہ ان مسائل کو کیونکر سلجھا پاتا۔ کیا اس مادی تہذیب کو دفن کر دینے کا مشورہ دیتا جو صرف تہذیب ہی نہیں بلکہ اپنے غلبہ میں تائید و نصرت کے لیے علوم و فنون اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی باقاعدہ فوج ظفر موج بھی رکھتی ہے۔ یا اس کی اصلاح کرتا، اس کا مزاج بدلتا، اسے سنوارتا، اسے پاکیزگی عطا کرتا اور اس میں اخلاق اور روحانیت کے ان پہلوؤں کو نکھارتا، جن کے نکھرنے سے تہذیب کھری مادیت کے نقطۂ نظر سے منحرف ہو کر اقدار و روحانیت کی راہ پر چل نکلتی ہے۔ یعنی اپنی پوری سج دھج اور بناؤ سنوار کے باوجود مقصد سے ناآشنا نہیں ہونے پاتی۔

تصویر اور نغمہ کی بحث میں بھی اس نقطۂ نظر کو ملحوظ رہنا چاہیے کہ انداز اب یہ نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ ان کے حق میں یا مخالفت میں جو دلائل محدثین اور فقہا و صوفیا کے درمیان استخوان نزاع بنے

رہے ہیں فیصلہ یہ کیا جائے کہ ان میں قوی تر کون ہے کیونکہ فکر کے اس نہج سے کچھ ہونے والا نہیں۔ اس سے اشکال حل نہیں ہوتا بلکہ اگر رائے یہ ٹھہرے کہ ان دلائل کے پیشِ نظر عدمِ جواز کا پہلو راجح ہے تو اس سے بھی بڑا اشکال ہمارے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ سوال یہ ہوگا کہ کیا ہم اس دور کے تہذیبی رجحانات سے بالکل الگ تھلگ اور غیر متاثر رہ سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سوال یہ شکل اختیار کرے گا کہ کیا اسلام کی تخلیق و اجتہاد کی قوتیں ان فنون کو نیا رنگ اور نیا موڑ عطا کر دینے سے قاصر ہیں۔ اگر فطرت گلے سڑے فضلاتِ نذا کو دودھ جیسی مفید اور تر و تازہ غذا میں بدل دینے پر قادر ہے اور دواساز (CHEMIST) مہلک و مضر اشیا سے حیاتین (VITAMIN) کا جوہر تیار کر دینے پر قدرت رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک مجتہد، اجتہاد و تخلیق کے اس عملیہ سے کام نہ لے سکے۔

الغرض بحث کا محور یہ نقطۂ نظر ہونا چاہیے کہ کیونکر ہم ان کو زیادہ سے زیادہ تعلیمی تدریسی، اور تہذیبی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور کس طرح ان میں اپنی قدروں کی عکاسی اور ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ فی نفسہٖ نغمہ اور تصویر کے ساتھ کوئی اخلاقی قدر وابستہ نہیں نغمہ صرف نغمہ ہے اور تصویر صرف تصویر یعنی نہ اچھی ہے نہ بری، اسی طرح نغمہ نہ اچھا ہے نہ برا۔ تصویر میں برائی اس وقت ابھرتی ہے جب اس سے شرک پھیلے۔ شخصیت پرستی اور بے حیائی کے داعیے تقویت حاصل کریں۔ اسی طرح نغمہ اس وقت مضر اثرات کا حامل ہوتا ہے جب اس سے فسق و فجور کی محل میں آراستہ کی جائیں یا اس سے محض سفلی جذبات کی تسکین کا کام لیا جائے لیکن اگر ان دونوں کا رخ خیر کی طرف پھیر دیا جائے، ان میں افادیت پیدا کر دی جائے اور ان سے تعلیم و تربیت اور قومی و ملی روایات کے احیا کا فائدہ اٹھایا جائے تو نہ صرف عدمِ جواز کا پہلو ختم ہو جاتا ہے بلکہ سے یہ دونوں ابلاغ کا موثر ذریعہ بن جاتے ہیں۔

---